از ڈاکٹر پروفیسر محمد حمید اللہ صاحب فرانس

اس مضمون کے بعض مقامات پر اختلاف رائے کی گنجائش ہے جیسا کہ مقالہ نگار نے بھی مضمون کے آخر میں ذرا ضمنی سا صراحت اسے قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے

اسلامی مملکت کا دستوری تصور

اور

اصول دستور

یہ مقالہ شہرۂ آفاق سکالر ورمحقق اسلام علامہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (حال مقیم فرانس) نے شریعت سیمینار اسلام آباد منعقدہ ۹ تا ۱۱ اکتوبر ۷۹ء میں پڑھا جو نذرِ قارئین ہے۔ "الحق"

اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ سہولت بخش ہوتا اگر مدعو افراد کو ایک سوال نامہ بھی بھیجا جاتا تاکہ وہ کچھ تیار ہو کر آتے اور کچھ ایسی چیزیں لکھ بھی بھیجتے جن کی ضرورت ہے نہ کہ ایسے امور جو شاید تحصیل حاصل ہوں۔ بہر حال فرمائش کی تعمیل اپنی حقیر قابلیت کے مطابق کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

بطور تمہید شاید یہ بیان کرنا تحصیل حاصل نہ کرنا ہو گا کہ دنیا میں انسانوں کی حکومت کا باعث کیا ہوا ہے۔

دنیا میں انسان کی حکومت | عام طور پر مشہور ہے کہ حضرت آدم و حوا شجرہ ممنوعہ کے قریب گئے تو سزا کے طور پر انہیں جنت سے نکال دیا اور خدا نے انہیں زمین پر بھیجدیا۔ اس پر دوبارہ جنت میں کیوں نہ داخل کر دیا گیا اور کیوں قید خانہ دنیا میں قیدی کو فرماں روائی دی گئی؟ معلوم ہوتا ہے کہ اسرائیلیات کے باعث یہ خیالات مسلمانوں میں پھیلے ہیں کیونکہ قرآنی تصریحات سے ان کی تائید نہیں ہوتی۔

قرآن مجید میں دو جگہ اس قصے کا ذکر ہے۔ سورہ ۲ آیت ۳۷ - ۳۸ میں ہے۔

"فتلقى ادم من ربه كلمات فتاب عليه انه هو التواب الرحيم قلنا اهبطوا منها جميعًا"

دوسری آیت میں (سورہ ۲۰۔ آیت ۱۲۱ تا ۱۲۳) میں ہے:

وعصیٰ آدم ربہ فغویٰ ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ وھدیٰ قال اھبطا منھا جمیعاً

دونوں جگہ صراحت ہے کہ توبہ قبول کرنے کے بعد خدا نے آدم و حوا کو حکم دیا کہ جنت سے "ہبوط" کر و۔ یہ بات معقول نہیں کہ توبہ قبول کرنے کے بعد کسی کو سزا دی جائے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ قرآن میں "ہبوط" کے معنی بلندی سے پستی میں گرا دیے جانے کے نہیں ملتے۔ یہ لفظ حضرت نوحؑ کے متعلق ہے کہ طوفان کے اختتام پر کشتی سے نکل کر خشک زمین پر جاؤ (یا نوح اھبط بسلام منا و برکات) اور دوسری جگہ ہے کہ بنی اسرائیل کو لذیذ تر چیزوں کی غذا مطلوب ہے تو صحرا کی جگہ شہر میں جا رہیں (اھبطوا مصراً فان لکم ما سألتم) غرض ہبوط کے معنی جانے کے ہیں گرنے اور خراب حالت میں آنے کے نہیں۔ اس پس منظر میں حضرت آدم کا قصہ یہ نظر آتا ہے کہ خدا نے فرشتوں کو پیشگی اطلاع دی۔ "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" (میں زمین میں ایک نائب بنانا چاہتا ہوں) فرشتوں نے جب یہ معلوم ہوا کہ اس سے خاکی آدم مراد ہے تو انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ یہ رتبہ تو کسی مطیع کو ملنا چاہیے نہ کہ مفسد اور سفاک کو۔ لیکن جلد ہی فرشتوں نے اعتراف کیا کہ ان کا علم محدود اور ناقص ہے۔ اس کے بعد جب خدا نے آدم کو پیدا کیا تو خلافت پر تعین من مانے نہیں ہوا۔ قرآن کا بیان ہے۔

"انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان انہ کان ظلوماً جھولاً"

"ہم نے امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کو پیش کی لیکن انہوں نے قبول نہ کیا اور وہ ڈرے مگر انسان نے اپنی نا انصافی اور جہالت کے باوجود اسے قبول کر لیا۔"

یقیناً خدا کی نیابت ہر کسی نے چاہی ہو گی۔ لیکن شرطیں انہیں کڑی معلوم ہوئیں یعنی خدا نے کہا تقدیر تو میں کروں گا لیکن جواب دہ یہ خلیفہ قرار دیا جائے گا۔ اور اس پر اوروں کو ڈر لگا اور امانت قبول کرنے سے خود ہی ہو کر انکار کر دیا۔ وہ انکار خود خود ہوشیار۔ انسان نے شاید یہ سوچا کہ خدا ظلم نہیں کر سکتا اور مجھے اس چیز کی سزا دی جائے گی جو میں نے نہ کی یا میرے امکان سے باہر ہو۔ پھر جب آدم نے قبول کر لی اور خلاق عالم کا خلیفہ بن گیا تو اسے مسجود ملائک بھی بنایا گیا۔ اور جنت میں اسے رہنے کو جگہ دی گئی۔ اس کے کچھ بعد شجرہ ممنوعہ کا حادثہ پیش آیا۔ جب آدم و حوا نے معافی مانگی تو ان کی توبہ قبول ہوئی اور اس کے بعد انہیں حکم ملا کہ خلافت الٰہی کا جائزہ لینے زمین پر جاؤ۔ یہ سزا انہیں سرفرازی تھی۔ گھر جنت ہی میں رہا۔ ملازمت کرنے زمین پر بھیجا گیا۔ خدمت انجام دینے کے بعد گھر آئیں تو جنت ہی میں رہیں گے۔

چونکہ زمین یا کائنات کی عمر طویل تر رکھی گئی اور انسان کی عمر مختصر تر۔ اس لئے ناگزیر تھا کہ آدم کی وفات کے بعد ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد کو تاقیام قیامت خلافت کرنی پڑے۔

یہ ہے انسان کی حکومت ارضی کا پس منظر۔ انسانی سماج کا ارتقا معلوم ہے۔ اور اس کا حرف اخیر ختم الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا۔

اسلامی حکومت | تبلیغ نبوی کا تاریخی مطالعہ کریں تو نظر آتا ہے۔ اسلام سے مراد شروع میں خدائے واحد کو ماننا اور اس کو حساب دینے کے لئے صحیح علم حاصل کرنا تھا (اقرا باسم ربك الذی خلق اقرا و ربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم) اس کے بعد عمل صالح کا مطالبہ ہوا۔ (اما الیتیم فلا تقھر و اما السائل فلا تنھر) تبلیغ پر بہ استثنا چند ٹھٹول ہوا اور اذیت دی جانے لگی جس سے نہ مبلغ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑا گیا۔ نہ ایمان والے رضی اللہ عنہم کو۔ جب اذیت ناقابل برداشت ہوگئی تو ہجرت حبشہ کا مشورہ دیا گیا۔ لیکن مفسدین مکہ نے فوراً ایک وفد بھیج کر ان پناہ گزینوں کے استرداد کا مطالبہ کیا۔ نجاشی نے انصاف پسندی کے باعث انکار کیا تو اہل مکہ نے کھسیانی بلی کی طرح رسول اکرم اور آپ کے اہل خاندان کا مقاطعہ کیا کہ کوئی نہ ان سے بات کرے نہ ان سے خرید و فروخت کرے نہ شادی بیاہ۔ اور سارے قبائل مکہ اور ان کے اطراف و اکناف کے حلیف قبائل نے اس میں شرکت کی۔ اس مقاطعے کے جو تین سال جاری رہا۔ شدت اتنی تھی کہ کئی آدمی بھوک پیاس سے مر گئے۔ اور ایک معجزہ تھا اور ایک معجزہ تھا کہ مابقی جانبر ہو سکے۔ جب مقاطعہ آخر ٹوٹا تو رسول اکرم کو ایک شدید تر ابتلاء سے سابقہ پڑا۔ انیس بیوی حضرت خدیجہؓ اور شفیق بزرگ خاندان ابوطالب نے وفات پائی۔ اور نئے رئیس قبیلہ ابولہب نے رسول اکرمؐ کو طرد (یعنی کنبہ بدر) کر دیا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ جو چاہے حضورؐ کو مار ڈالے۔ قبیلہ نہ آپ کی مدافعت کرے گا نہ قاتل سے باز پرس۔ اس پر مجبوراً رسول اکرمؐ نے ترک وطن فرمایا۔ اور چاہا کہ طائف میں متوطن ہو جائیں۔ لیکن وہاں کی فضا مکہ معظمہ سے بھی بدتر نظر آئی۔ کیا کریں اور کہاں جائیں؟ اس بے بسی کے عالم میں وہ مشہور عالم دعا کی جو خاتم الانبیا ہی سے ممکن تھی۔ اور جواب بھی دلوں کو تڑپا دیتی ہے۔

اللھم الیك اشکو ضعف قوتی، وقلة حیلتی، و ھوانی علی الناس۔ یا ارحم الراحمین انت رب المستضعفین، و انت ربی۔ الی من تکلنی؟ الی بعید یتجھمنی ام الی عدو ملکته امری؟ ان لم یکن بك علی غضب فلا ابالی۔ ولکن عافیتك ھی اوسع لی۔ اعوذ بنور وجھك الذی اشرقت له الظلمات، وصلحت علیه امر الدنیا والآخرة من أن ینزل بی غضبك، او یحل علی سخطك۔ لك العتبی حتی ترضی ولا حول ولا قوة الا بك۔

ایک عزمِ مصمم کے ساتھ مکہ ہی واپس ہوتے ہیں لیکن اسوۂ حسنہ قائم کرنا تھا۔ عالم اسباب کی ضرورتوں کے مطابق عدل فرماتے ہیں۔ مکے میں وہاں کے باشندے کی طرح نہیں ایک پناہ گزیں کی طرح جاتے ہیں۔ اور مضافات میں پہنچ کر پہلے اپنی بیوی حضرت سودہؓ کے ایک رشتہ دار سہیل بن عمرو سے پناہ دہی کی خواہش کرتے ہیں۔ اس نے معذرت کی تو اخنس بن شریق سے جو آپ کی ماں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس نے بھی انکار کیا تو اپنی مرحوم بیوی حضرت خدیجہؓ کے ایک رشتہ دار مطعم بن عدی سے خواہش ظاہر کی۔ اس نے قبول کر لیا۔ اور شہر سے باہر جا کر آپ کو ساتھ لے آیا۔ مگر اس کے معنی یہ تھے کہ اب آپ شہر مکہ کی "سیاست" میں حصہ نہ لیں یعنی تبلیغ سے باز رہیں۔ اس کا حل آپ نے یوں فرمایا۔

حج کے زمانے میں باہر سے آنے والے حاجیوں میں پرچار کریں۔ اور ممکن ہو تو جا کر اسی میں بس جائیں۔ اس کی کوشش کی اور یکے بعد دیگرے پندرہ قبیلوں کے حاجیوں میں گئے اور ناکام رہے۔ استقلال کے کیا کہنے پھر بھی ہمت نہ ہاری۔ آخر سولھویں گروہ نے جو چھ اہلِ مدینہ پر مشتمل تھا اسلام کو فوراً قبول کر لیا۔ اور اس خلوص کے ساتھ کہ گھر جا کر اس کی تبلیغ کی اور ایک سال بعد بارہ نئے جویانِ حق لوگوں کو بھیجا۔ انہوں نے بیعت کرنے کے بعد التجا کی کہ ایک مبلغ و مدرس کو مدینہ بھیجیں۔ اس کی کوشش سے ایک ہی سال بعد بہتر آدمی حج کے زمانے میں آ کر نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ عرض کیا کہ آپ اور سارے مصیبت زدہ مسلمان مدینہ ترکِ وطن کر لیں۔

مکی مسلمان بتدریج مدینہ جانے لگے تو مشرکین کو خوف ہوا کہ کہیں ایک دن یہ مکے پر چڑھائی نہ کر دیں۔ اس لئے جبرٌ بروار کرنا طے کیا۔ یعنی سرورِ کائنات ہی کو شہید کر دیں۔ اس پر حضورؐ اور آپ کے یارِ غار ابوبکرؓ صدیق بھی مدینہ روانہ ہو جاتے ہیں۔ مگر اہلِ مکہ اس پر بھی چین لینے نہیں دیتے۔ انہوں نے اہلِ مدینہ کو دھمکی لکھ بھیجی کہ یا تو وہ آں حضرت کو قتل کر دیں یا اپنے ملک سے نکال دیں۔ ورنہ اہلِ مکہ مناسب تدبیریں اختیار کریں گے۔

اب رسولِ اکرمؐ نے محسوس فرمایا کہ مذہب کی تبلیغ کے لئے اس کی مدافعت بھی ناگزیر ہے۔ یہ ہے وہ پس منظر جس میں آپ نے مدینے میں ایک شہری مملکت کی بنیاد رکھی۔ اس کے لئے جو تدبیریں اختیار کیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اولاد مہاجرین کی بسر بود کا انتظام کیا اور اس کے لئے ان میں اور اہلِ مدینہ میں مؤاخات کی تجویز پیش فرمائی اہلِ مدینہ کی نیک دلی نے چشم زدن میں کئی سو پناہ گزینوں کی ساری مشکلوں کو حل کر دیا۔ اس کے بعد آپ مدینہ اور آس پاس کے سارے مسلمانوں اور غیر مسلم قبائل کے نمائندوں کو جمع فرما کر ان سے فرمایا کہ تمہارے علاقے میں کوئی مملکت یا مرکزیت نہیں ہے۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ ہر قبیلہ اپنے آپ پر تکیہ کرنے پر مجبور رہا اور اپنے سے قوی تر دشمن کے مقابلے میں بے بس ہے۔ اس لئے کیوں نہیں یہاں ایک مملکت قائم کی جائے جس میں ہر قبیلے کو آزادی بھی رہے اور دشمن سے مقابلے کے لئے ہمسایوں کی معاونت بھی۔ بات دل کو لگی اور مسلمانوں غیر مسلم عربوں اور یہودیوں

اسے قبول کر لیا۔ قبیلہ اوس کے تین قبیلے جو ابو عامر راہب کے تابع تھے اور غالباً عیسائی تھے اس سے الگ رہے اس طرح شہر مدینہ کے ایک حصے میں ایک شہری مملکت کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس کے لئے باہمی مشاورت سے ایک تحریری دستور بھی مدون ہوا جو من و عن تاریخ میں نقل ہو کر ہم تک پہنچا بھی ہے (جس کا ذکر آگے آئے گا)

اس زمانے میں نہ صرف تبلیغ دین کا کام جاری رہا ہے بلکہ تدبیریں بھی اختیار کی جاتی رہیں۔ مثلاً یہ حکم دیا گیا کہ مسلمان ہر جگہ سے ترک وطن کر کے مدینہ آ بسیں۔ اس طرح مسلمان جلدی ہی مدینے میں اقلیت کی جگہ اکثریت بن جائیں محرم ۲ ہجری جیسے ابتدائی زمانے میں ہجرت نبوی کے صرف نو ماہ بعد مدینے کے مضافات میں بین نامی مقام پر قبیلہ اسلم کے نومسلموں کی ایک نو آبادی ملتی ہے جیسا کہ سمہودی وغیرہ نے ذکر کیا ہے۔

شہری مملکت مدینہ کی تاسیس کے فوراً بعد رسول اکرمؐ نے مدینہ کے اطراف کے قبائل پر توجہ فرمائی شمال میں جہینہ جنوب مغرب میں بنی ضمرہ۔ بنی غفار وغیرہ کے علاقوں کا سفر کر کے ان کے سامنے بھی دفاعی حلیفی پیش کی۔ کہ تم پر کوئی حملہ کرے تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔ اور ہم پر کوئی حملہ کرے تو تم بھی ہماری مدد کو آؤ۔

جب اس میں معتدبہ کامیابی ہوئی اور اسلامی سرزمین کی حفاظت کے ابتدائی انتظامات حسب دل خواہ مکمل ہو گئے تو مکے کو زیر کرنے کی تدبیر شروع کی گئی۔ اور اس کے لئے جنگ کی جگہ معاشی دباؤ کو ترجیح دی گئی چنانچہ حکم دیا گیا کہ مکے کے تجارتی کارواں (عراق، شام اور مصر) کو جانا چاہیں تو مدینے اور اس کے زیر اثر (حلیف) علاقے سے گزریں اہل مکہ نے اسے قبول نہ کیا اور زبردستی گزرنا چاہا۔ اس پر بدر، احد اور خندق کی جنگیں ہوئیں۔ پھر حدیبیہ کی صلح اور آخر میں فتح مکہ اور اہل مکہ کے خوش دلانہ اسلام قبول کر لینے پر اس کش مکش کو جو بیس سال جاری رہی حسن اختتام نصیب ہوا۔

اس اثنا میں دوسرے محاذوں پر بھی عملیت جاری رہی۔ اور فتح مکہ کے ڈھائی سال بعد جب رسول اکرمؐ نے وفات پائی تو اس وقت اسلامی مملکت جو سن ہجری میں شہر مدینہ کے ایک حصہ پر شروع ہوئی تھی بڑھتے بڑھتے تین ملین مربع کیلومیٹر علاقے پر پھیل گئی تھی۔ اور تجربہ روزگار رہا تھا کہ روزانہ ساڑھے آٹھ سو مربع کلومیٹر کے مسلسل الحاق کے باوجود دشمن کا ماہانہ مشکل سے ایک آدمی میدان جنگ میں قتل ہوتا رہا۔ دس سال کے ایک سو بیس مہینوں میں مشکل دشمن کے دو سو آدمی کھیت رہے اور تین ملین کلومیٹر کو اسلامی امن چین اور خدا کی حکومت نصیب ہو گئی۔

اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ اس لئے چند نکات کی طرف اشاروں پر اکتفا کروں گا۔

تحریری دستور | رسول اکرمؐ نے تاریخ عالم میں پہلی دفعہ تحریری طور پر دستور مملکت مدون اور نافذ فرمایا

ابن ہشام کی سیرت رسول اللہ نے ۔ ابو عبید کی کتاب الاموال نے اور ابن ابی خیثمہ کی روایت کو ابن سید الناس نے نقل کیا ہے اور یہ باون دفعات پر مشتمل ایک جامع دستور ہے جس میں اس زمانے کی ساری ضرورتوں کو صراحت سے بیان کیا گیا ہے ۔ مثلاً پہلی دفعہ میں ذکر ہے کہ مسلمان انصار و مہاجرین سے ان کے تابع ہونے والوں اور ان کے ہمراہ جنگ پر آمادہ لوگوں پر مشتمل ایک "امت" قائم کی جاتی ہے جو ساری دنیا کے مقابلے میں ایک مستقل وحدت کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس میں یہودیوں کے لئے کامل دینی آزادی کی صراحت ہے مسلمانوں میں عاقل یعنی سماجی بیمے کا نظام قائم کیا گیا ہے ۔ اور دلچسپ طور پر قبائلیت کے خاتمے کا انتظام کیا گیا ہے ۔ چنانچہ اول تو یہ حکم ہے کہ اگر ایک قبیلے کی ضرورت کے لئے اس کا اپنا معاقل سرمایہ کافی نہ ہو تو دوسرے ہمسایہ قبیلوں کی انجمن ہائے بیمہ اس کی مدد کریں ۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ مکی مہاجرین کا ایک نیا قبیلہ قائم کیا گیا ۔ اہل مکہ ایک نہیں بہ کثرت قبیلوں کے تھے مگر ان کی تعداد اتنی کم تھی کہ سارے مہاجرین کا ایک قبیلہ مہاجرین قرار دیا گیا ۔ دوسرے الفاظ میں قبیلہ خونی رشتہ داری پر نہیں بلکہ ہم خیال لوگوں کی خواہش اتحاد پر مبنی ہو ۔ اس طرح قبائلی اختلاف کی جگہ اسلامی اتحاد ذہنوں میں راسخ کیا گیا ۔ اور جلدی ہی دارالسلام اور دارالکفر دنیا میں صرف دو قومیں قبول کی گئیں ۔ جب تک مسلمانوں نے اسے نہ بھلایا "اسمعوا واطیعوا ولو امّر علیکم حبشی اجدع" اولاد آدم کی خوش بختی کا سامان کرتی رہی ۔ مغرب جدید کی خونی ۔ رنگی ۔ زبانی اور جغرافی قومیتیں مسلمانوں میں آئیں تو مسلمانوں ہی نہیں ساری انسانیت کے لئے خسارے کا باعث بنیں اور بدقسمتی سے ہنوز اس کا سلسلہ جاری ہے ۔

اس دستور میں انصاف کو افراد یا قبیلے سے بھی لے کر مرکز کے سپرد کیا گیا ہے ۔ جو اس زمانے کے لئے ایک انقلابی واقعہ تھا ۔ عدل گستری اگرچہ ایک حد تک قبائلی سرداروں کے سپرد رہی ۔ لیکن ایک تو بین القبائل جھگڑوں میں اور دوسرے مرافعہ (اپیل) میں مرکز سے رجوع ناگزیر تھا ۔ جنگ اور صلح کو مشترکہ مفاد کا مسئلہ قرار دیا گیا اور ناقابل تقسیم یعنی یہ نہیں کہ چند کنبوں اور قبیلوں سے صلح ہو اور باقی رعایا سے جنگ ۔ قانون سازی بھی مرکزی مسئلہ رہی اور ہر ملت (مسلمان ، یہودی وغیرہ) من حیث الکل خود مختار رہی اور ظاہر ہے کہ اسلام کے لئے قرآن و حدیث ہی واحد ماخذ تشریح رہے ۔

اس دستوری دستاویز کی کامل تحلیل یہاں بے محل ہوگی ۔

طرز حکومت ۔ قرآن مجید میں صرف بادشاہوں کا ذکر ہے ۔ اچھے بادشاہ بھی جیسے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ ۔ اور برے بادشاہ بھی جیسے فرعون اور نمرود ۔ دوسرے الفاظ میں بادشاہت کوئی ممنوع طرز حکومت نہیں قرآنی آیت ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا ۔ بلکہ بلقیس کے اس قول کو قرآن نے نقل کیا ہے اور وہ برے بادشاہوں کے طرز عمل سے عبارت ہے جس طرح خضر علیہ السلام کے

الکہف

قصے میں بیان شدہ اچھے جہازوں کو ظلم سے ضبط کرنے والے بادشاہ کا ذکر ہے کہ:

"کان وراءھم ملک یاخذ کل سفینۃ غصبا"

قرآن میں جمہوریت کا کہیں ذکر نہیں ہے اگرچہ قبل اسلام یونان و روما میں جمہوریتیں قائم ہو چکی تھیں۔ سنت نبوی ؐ
میں مشترکہ حکمرانی کو برقرار رکھنے کا بھی ذکر ہے (جو آج کل بعض ملکوں میں پائی جانے والی جماعتی یا کلیجیل گورنمنٹ
سے مشابہت رکھتی ہے) چنانچہ عمان میں جیفر بن الجلندی اور عبد بن الجلندی دو بھائی مشترکہ حکمران تھے رسول
اکرم ؐ نے ان کے اسلام لانے پر انہیں ان کی مشترکہ حکمرانی پر برقرار رکھا۔
اس صورت حال کے باوجود رسول اکرم ؐ کی وفات پر مسلمانوں نے بادشاہت قائم نہیں کی اور نہ بادشاہت کو
واجب سمجھا بلکہ صرف جائز قرار دیا۔ اور اپنے لئے خلافت راشدہ کو پسند کیا۔ یعنی بادشاہت سے مراد ایک خاندان
میں موروثی طور پر حکمران کا پایا جانا ہوتا ہے جو تاحیات حکمرانی کرتا ہے۔ اور عموماً کارفرما حکمران اپنے کسی قریبی
رشتہ دار کو اپنا جانشین نامزد کرتا ہے اور کبھی اتفاقاً وہ کسی کی نامزدگی کے بغیر مر جاتے تو ارباب حل و عقد اس
کسی رشتہ دار کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ اور کوئی دشمن فتح اور غلبہ حاصل کر لے تو اسے تسلیم کر لیتے ہیں اور پھر ایک نیا
خانوادہ برسر اقتدار آ جاتا ہے۔ جمہوریت میں مادام الحیات کی جگہ معین مدت کے لئے انتخاب عمل میں آتا ہے۔
جمہوریت ہی نہیں بادشاہت میں بھی حکمران کے فرائض اور اختیارات معین ہو سکتے ہیں۔
رسول اکرم ؐ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ اس بیان میں حضور کی توہین نہیں کیونکہ حضرت داؤد اور حضرت
سلیمان ؑ بھی بیک وقت نبی اور بادشاہ تھے۔ رسول اکرم ؐ کی وفات پر آپ کے چچا عباس ؓ اور چچا زاد بھائی علی ؓ
کی خواہش ضرور نظر آتی کہ خانوادہ دارانہ اور وراثتی حکومت قائم کریں۔ لیکن امام بخاری ؒ کی روایت کے مطابق رسول
اکرم ؐ نے فرمایا تھا لن نستعمل علی امرنا من ارادہ (کوئی شخص حکومت کے کسی عہدے کا خواہش مند
ہو تو ہم اسے کبھی اس پر مامور نہیں کریں گے) صحابہ کی اکثریت نے جب اپنے لئے خلافت راشدہ (یعنی غیر موروثی
منتخب اور مادام الحیات حکمرانی) کو پسند کیا تو خدا نے اہل بیت نبوی ؐ کو اس برائی سے بچا دیا جس میں وہ بے خیالی
سے ملوث ہونا چاہتے تھے۔
جیسا کہ عرض ہوا۔ خلافت راشدہ کوئی جمہوریت نہ تھی کیونکہ خلفاء راشدہ کا انتخاب معین مدت کے
لئے نہیں کیا جاتا تھا جو جمہوریت کا اساسی اصول ہے۔ وہ بادشاہت بھی نہ تھی کیونکہ رشتہ دارانہ وراثت کا
اس میں لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ بعض مورخوں کا بیان ہے کہ حضرت علی ؓ نے اپنے بعد اپنے بیٹے امام حسن کو ولی
عہد نامزد کیا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے تو خانوادہ دارانہ بادشاہت اور باپ کے بعد بیٹے کے جانشینی نہ صرف
"وورث سلیمان داؤد" کی آیت پاک کے مطابق ہوگی۔ بلکہ خلفائے راشدین کی نظیر بھی اس کی تائید میں

پیش کی جا سکے گی۔

خلافت راشدہ کے انتخاب میں ہمیں کئی اصول کار فرما نظر آتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت علیؓ کا انتخاب ارباب حل و عقد خود کرتے ہیں کیونکہ سابقہ حکمران کی کوئی سفارش صراحت سے موجود نہ پائی گئی۔ حضرت عمرؓ کے لئے سابق خلیفہ نے صراحت کی ان کی وفات پر چھ بہترین افراد جن کا نام اس وصیت نامے میں تھا۔ کسی ایک کا اپنے میں سے انتخاب کریں۔ اور اگر رائیں مساوی ہو کر گتھی پڑ جائے تو ایک ساتویں رکن کو بھی نامزد کیا کہ صرف گتھی کی حالت میں رائے دے۔ اور یہی اس فریق کے لئے جس کی طرف حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ہوں اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب حضرت عمر زخمی ہوئے تو حضرت عبدالرحمن کو یاد فرمایا۔ انہوں نے خیال کیا کہ شاید مجھ ہی کو ولی عہد بنانا چاہتے ہیں۔ اس لئے آتے ہی سلام کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے خلیفہ نامزد نہ کیا جائے۔ مجلس انتخاب نے انتخاب کا فریضہ حضرت عبدالرحمنؓ کے سپرد کر دیا۔ اور جیسا کہ ابن کثیر نے صراحت سے بیان کیا ہے انہوں نے کئی دن اور کئی رات شہر مدینہ کے ہر طبقے کے لوگوں سے رائے پوچھیں۔ عالموں سے بھی تاجروں سے بھی۔ عارضی مقیم مسافروں سے بھی۔ طلبہ سے بھی۔ اساتذہ سے بھی۔ مردوں سے بھی۔ عورتوں سے بھی اور دیکھا کہ ان ہزاروں آدمیوں میں سے صرف دو حضرت علی کے لئے اور باقی حضرت عثمان کے لئے تھے۔ اس رائے طلبی کے بعد بھی انہوں نے دونوں امیدواروں سے پوچھا۔ کیا آپ وعدہ کرتے ہیں کہ قرآن اور سنت نبوی اور ابو بکرؓ و عمرؓ کی نظیروں کے مطابق عمل کرو گے؟

حضرت عثمانؓ نے ہاں کہا۔ اور حضرت علیؓ نے کہا کہ قرآن و حدیث بے شک۔ لیکن ابو بکرؓ و عمرؓ کی طرح مجھے بھی اجتہاد کا حق ہے۔ اس پر حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نے حضرت عثمان کے انتخاب کا اعلان کیا۔ جہاں تک امام حسنؓ کا تعلق ہے ہم نے ابھی اوپر بیان کیا کہ بعض مورخوں کے مطابق انہیں ان کے والد حضرت علیؓ نے اپنا جانشین نامزد کیا تھا۔ اگرچہ دوسرے مورخ کہتے ہیں کہ ان کے الفاظ یہ تھے۔

"حسن کی بیعت کا نہ میں تمہیں حکم دیتا ہوں اور نہ اس سے منع کرتا ہوں"

اقتدار اعلیٰ اقتدار اعلیٰ سے مراد یہ ہوتی ہے کہ قانون سازی ہو یا کوئی اداری و انتظامی امر، حرف آخر کیسے حاصل ہو؟ اس سلسلے میں اکثر اسلامی ممالک میں آج کل ڈیموکریسی کی اصطلاح روز افزوں استعمال ہونے لگی ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنے ہیں عوام الناس کی حکومت۔ یعنی اہل ملک کی اکثریت کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے اور یہ ہر امر میں۔ عوام یا ان کے نمائندے مذہب کو بھی بدل سکتے ہیں دن کو رات یا رات کو دن کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ ایسا نہ کریں۔ لیکن انہیں ایسا کرنے کی کامل آزادی حاصل ہے۔ اس وجہ سے یہ اصطلاح اسلامی حکومت کے لئے موزوں نہیں۔ اس لئے پاکستان نے یہ طے کیا تھا کہ اقتدار اعلیٰ خدا کی ذات کو حاصل ہے اور یہ انسان کی امانت

میں دیا گیا ہے یعنی خدا اور رسولؐ نے جو احکام دئیے ہیں وہ بدلے نہیں جا سکتے اور قرآن و سنت کے سکوت کے وقت قرآن و سنت میں بتائے ہوئے اصول کے مطابق احکام کا استنباط کیا جائے۔ خاص کر حدیث معاذ رضی اللہ عنہ " نحکم بکتاب اللہ - فان لم تجد فبسنة رسول اللہ ؟ فان لم تجد اجتھد برائی

قرآن میں بارہا مشورت پر زور دیا گیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں سبعین رجلا لمیقاتنا میں کثیر جماعت کی ایک متناسب قلیل جماعت کے ذریعے سے نمائندگی کا جواز بھی بتایا گیا ہے لیکن طریقۂ انتخاب کی تفصیلیں نہ ہونے کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں انسان کو حسب ضرورت عمل کی آزادی ہے۔

جو لوگ انتخاب کرتے ہیں انہیں معزول کرنے کا بھی حق ہونا ناگزیر ہے مثلاً ہمارے بڑے فقہا میں سے کاسانی (بدائع الصنائع ، ج ۷ ص ۱۶) نے خلیفہ کو وکیل سے مشابہت دی ہے اور جس طرح کوئی موکل جب چاہے اپنے وکیل کو معزول کر سکتا ہے۔ خلیفے کو بھی اصحاب حل و عقد معزول کر سکتے ہیں۔ ان حالات میں حکمران کے مادام العمر انتخاب میں کوئی عملی قباحت بھی نہیں رہتی۔ ملک کی مجلس مشاورت جب چاہے نا اہل حکمران سے گلو خلاصی کر سکتی ہے۔ موقتی انتخاب میں اچھے حکمران کے تجربوں سے محرومی سے سابقہ رہتا ہے۔

یہ بھی یاد دلانا چاہئے کہ اسلامی نظام میں بیعت کو ہمیشہ سے اہمیت رہی ہے۔

رسول اللہؐ پر ایمان لانے والے لوگ بھی بیعت کرتے اور اطاعت کا وعدہ کرتے تھے۔ اگر کسی حکمران نے اپنے جانشین کو نامزد بھی کیا ہو تو وہ صرف سفارش ہوتی ہے۔ اور اس کی تکمیل کے لئے ارباب حل و عقد بیعت کرتے ہیں جو لوگ بیعت کر کے کسی کو مامور کرتے ہیں تو وہ معزول بھی کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ خود حکمران استعفا بھی دے سکتا ہے۔ اس سلسلے میں امام حسن کی مثال دی جا سکتی ہے۔ حضرت علی کی وفات پر ان کے متبعین نے امام حسن کی بیعت کی لیکن فوج میں اتنی بدنظمی تھی کہ انعام و اکرام کے مطالبے پر جب امام حسنؓ نے حسب دل خواہ رقم تقسیم نہ کی تو فوج نے خلیفہ کا خیمہ لوٹ لیا اور وہ زخمی ہو کر جان بچا کر وہاں سے بھاگ سکے اور مدینے میں پناہ لی۔

اس کے بعد حضرت معاویہؓ سے انہوں نے معاہدہ کر کے اپنی خلافت سے ان کے حق میں دست برداری دی اور یہ شرط کی کہ حضرت معاویہؓ کے بعد وہ ساری اسلامی سرزمین کے خلیفہ ہوں گے مگر وہ حضرت معاویہؓ کے جیتے جی فوت ہو گئے۔

غیر مسلم رعیت | اسلام نے " لا اکراہ فی الدین " کا قابل ناز اصول قائم کیا ہے۔ اسی طرح غیر مسلم لوگ اگر رعایا بننا قبول کریں تو انہیں ہر طرح کی آزادی رہتی ہے۔ اور اس سلسلے میں " ولیحکم اہل الانجیل بما انزل اللہ فیہ " کا اصول بھی قرآن مجید نے صراحت سے واجب قرار دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عہد نبوی ہی سے غیر مسلموں کو اسلامی

مملکت میں نہ صرف ضمیر، دین اور عبادت کی، بلکہ قانون کی بھی خود اختیاری حاصل رہی ہے۔ کسی مقدمے کے، چاہے دیوانی ہو
یا فوجداری۔ فریقین مثلاً عیسائی ہوں تو عدالت بھی عیسائی۔ حاکم عدالت بھی عیسائی اور قانون بھی عیسائی ہوتا ہے اور
مرافعہ (اپیل) تک اسلامی عدالت میں نہیں آتا۔

اس میں دو ایک ذیلی استثنا ہیں۔ اگر غیر مسلم فریقین خود اپنی ملی عدالت کو ترک کریں اور اسلامی عدالت
میں رجوع کریں تو اس سے انکار نہیں کیا جاتا۔ اصولاً تو اس صورت میں فریقین پر اسلامی قانون نافذ ہونا چاہیے تھا۔
لیکن عہد نبوی کی متعدد نظیریں ہیں کہ رسول اکرمؐ نے ان غیر مسلموں پر جو آپ کے پاس رجوع ہوئے تھے انہیں کا قانون
نافذ فرمایا۔ غالباً اسی وجہ سے امام محمدؒ شیبانی نے اپنی کتاب السیر الکبیر میں صراحت کی ہے کہ ان کے زمانے میں
مسلمان قاضی غیر مسلم فریقین پر انہیں کے قانون کے مطابق فیصلہ کیا کرتا تھا۔

دوسرا مسئلہ جس میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی مقدمے کے فریق دو مختلف ملتوں کے ہوں
ایک عیسائی اور ایک یہودی، یا ایک مسلمان اور دوسرا غیر مسلم۔ اس کا تعلق تصادم قوانین (کنفلیکٹ آف لا)
سے ہے۔ اور علی العموم مدعی علیہ کے قانون کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے۔ غیر مسلم رعایا کو مذہبی اور قانونی خود
اختیاری دینے سے تجربہ بتاتا ہے کہ اسلامی حکومت کو کبھی نقصان نہ پہنچا۔ خلفائے راشدین کے زمانے سے
لے کر حروب صلیبیہ اور اس کے بعد تک کی ان گنت نظیریں ہیں کہ جب کبھی کسی غیر مسلم حکمران نے اسلامی سرزمین پر حملہ کیا
اور اپنے ہم مذہب ذمیوں کو اکسایا کہ بغاوت کریں تو انہوں نے ہمیشہ یہ جواب دیا کہ ہم تیری رعیت بننے پر مسلمانوں
کی رعیت رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ عیسائی مورخوں اور پادریوں نے جل کر ان "فضیحت آمیز" جوابات کا ذکر کیا ہے۔

اس قانونی مرکز گریزی سے بعض دشواریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو اس کا چودہ سو سال سے تجربہ
ہے۔ مثلاً غیر مسلم رعایا کو شراب نوشی اور شراب فروشی کی آزادی رہ سکتی ہے۔ اور مسلمان اس سے "فائدہ" نہیں
اٹھاتا۔ غیر مسلم کتابیہ عورت سے مسلمان نکاح کرے تو غذا کے علاوہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے مسئلے بھی پیدا
ہوتے ہیں۔ مشترکہ مسائل میں غیر مسلم رعیت کو مشاورت میں بھی شریک رکھا جاتا ہے۔ اور حضرت عمرؓ کے زمانے
کی نظیریں اس بارے میں موجود ہیں۔

مالی مسائل میں چند نکات قابل ذکر ہیں۔ غیر مسلم رعیت کو شراب و خنزیر جیسے امور ہی میں نہیں بلکہ نقد رقم
کی زکوٰۃ سے بھی مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مسلم اور غیر مسلم نظم و نسق کو الگ الگ رکھا گیا تو غیر مسلم ملت کے انتظامی مصارف
کے لئے زکوٰۃ النقدین سے اسلامی مرکزی حکومت نے دست برداری دے دی اور وہ رقم غیر مسلم خود وصول کرتے
اور خود خرچ کر سکتے تھے۔

دیگر محاصل (ٹیکس) مثلاً زکوٰۃ التجارۃ، زکوٰۃ الارض، زکوٰۃ المعادن وغیرہ مرکزی حکومت ہی سے متعلق اور چونکہ غیر مسلم رعیت سود خوری کی آزادی سے زیادہ تیزی سے متمول ہو جاتی ہے اس لئے اس سے بعض محاصل زیادہ بڑی شرح سے لئے جاتے ہیں، مثلاً زکوٰۃ التجارہ مسلمان سے ڈھائی فیصد تو ذمی سے پانچ فیصد اور حربی سے ۱۰ فیصد لی جاتی رہی۔ زکوٰۃ الارض میں مسلمان سے پیداوار کا عشر لیا جاتا تو غیر مسلم سے معاہدات کے مطابق معینہ خراج لیا جاتا اور یہ ہر علاقے میں مختلف رہا ہے۔ ایسی بھی نظیریں ہیں، مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک ذمی سے اس کی خراجی زمین خریدی تو اسلامی محکمہ مالیہ نے ان سے عشر کی جگہ سابقہ خراج ہی کی مقدار میں محصول کا مطالبہ کیا تھا۔

جزیہ عجیب سا مسئلہ ہے۔ اپنے فرزند ابراہیمؑ کی وفات پر رسول اکرمؐ کا یہ قول مروی ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا تو میں اس کی ماں کی قوم یعنی قبطیوں سے جزیہ معاف کر دیتا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ جب ایک قحط کے زمانے میں ایک یہودی نے نہر سویز کی پیشرو نہر کے مقام کی نشاندہی کی جو مٹی سے بھر کر غائب ہو چکی تھی۔ اور وہاں حضرت عمرؓ نے نہر امیر المومنین کھدوا کر مصر سے بحیرہ قلزم کو ملا دیا۔ اور مصر سے کشتیاں راست مدینے کے قریب بندرگاہ تک جا پہنچ سکیں۔ تو حضرت عمرؓ نے خوش ہو کر اس یہودی کو تاعمر جزیے سے مستثنیٰ فرما دیا۔

پاکستان کے آغاز پر جب ایک مجلس تعلیمات اسلامی قائم کر کے مجلس دستور ساز کی اسلامی   کا انتظام کیا گیا تو اس مجلس نے مذکورہ نظائر کی موجودگی کے علاوہ اس امر پر بھی توجہ منعطف کرائی تھی کہ آج کل غیر مسلم ملکوں میں لاکھوں کروڑوں مسلمان بستے ہیں اور ہندو، عیسائی اور یہودی ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں پر اسلامی ملکوں کے جزیے کے ردعمل کا امکان ہوگا۔ یہ امر البتہ اسلامی ملکوں کے غور کا محتاج ہے کہ ان کے ہاں تو عیسائی یہودی اور ہندو وغیرہ غیر مسلم داخلی خود اختیاری رکھتے ہیں۔ لیکن مغربی ممالک میں نہ صرف عارضی مقیم بلکہ وہاں کی مسلم رعایا کو بھی نکاح، طلاق، وراثت جیسے مسائل شخصی میں بھی اسلامی قانون پر عمل کی اجازت نہیں ہے۔ جو اسلامی ملکوں کے لئے آسان ہے کہ اپنی دوست غیر مسلم مملکتوں کو دوستانہ مشورہ دیں کہ ان کے ہاں بھی مسلمان ساکنین کو مقامی قانون سے مستثنیٰ کر کے اسلامی قانون پر عمل کرنے کی اجازت دی جائے۔

متفرقات | حکومت کے فرائض، مغرب میں تنفیذیہ، تشریعیہ اور عدلیہ تک محدود سمجھے جاتے ہیں۔ اسلامی تصور حکومت میں ثقافیہ کے اضافہ کرنے پر مجبور ہے۔ کہ اسلام کا مقصد حیات ہی حکومت الٰہی کا پرچار ہے۔ شعائر اسلامی کا نفاذ اسلامی مملکت میں نہ ہو تو کہاں ہو سکے گا۔ اس کی تفصیل میں گئے بغیر شاید عورت کے پردے کے متعلق چند الفاظ پر اس مختصر یادداشت کو ختم کیا جاتا ہے۔

عورت کے لباس کے متعلق آج کل مسلمان اہل قلم میں کچھ اختلاف نظر آتا ہے بعض لوگ کہہ رہے ہیں کہ چہرہ اور ہاتھ کو ڈھانکنا ضروری نہیں اگرچہ یہ لوگ دو حدیثوں سے استدلال کرتے ہیں۔ ایک حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ایک دن وہ رقیق لباس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں گئیں۔ تو فرمایا۔ اے اسماءؓ جب عورت بالغ ہو جائے تو اسے سارا بدن ڈھانکنا چاہئے، بجز چہرے اور ہاتھوں کے۔

دوسری حدیث یہ ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلعم نے ایک وعظ فرمایا۔ تو سانولے رنگ کی ایک عورت نے اٹھ کر کچھ سوال کیا۔ اور حضورؐ نے اسے جواب دیا (یعنی عورت بے نقاب تھی۔ اور اسے سب لوگوں نے دیکھا۔

ان دونوں حدیثوں کا زمانہ معلوم نہیں۔ آیا نقاب کی آیتوں کے نزول سے پہلے کی ہیں یا بعد کی۔ دوسرے حضرت اسماءؓ کے متعلق یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ حضورؐ کی سالی یعنی محرم تھیں (کہ دو بہنوں سے بیک وقت نکاح نہیں کیا جا سکتا) اور سالی سے پردہ نہیں کیا جاتا۔ اور نقاب کے سلسلے میں اجنبیوں، قریبی رشتہ داروں اور محرموں میں فرق کیا جاتا ہے۔ سانولے رنگ والی عورت کے قصے میں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کوئی آزاد عورت تھی یا لونڈی (اور لونڈی کو نقاب کرنے کی ضرورت نہیں) نہ یہ معلوم کہ وہ جوان عورت تھی یا معمر کہ معمر عورت کو بھی نقاب کی ضرورت نہیں۔

ان حالات میں مذکورہ حدیثوں سے عام عورت کے متعلق استدلال بحث طلب ہو جاتی ہے۔ عام اسلامی قانون قرآن کی دو آیتوں میں ہے۔ پہلے جلابیب کا حکم نازل ہوا اور عورتیں گھر سے باہر جائیں تو برقعہ پہن لیتیں اور سارا چہرہ بھی ڈھانپ لیتیں (اور راستہ دیکھنے کے لئے ایک آنکھ البتہ نقاب سے باہر نکالتیں) ان سے غالباً یہ مطلب لیا گیا کہ گھر پر شوہر کے اقارب سے پردہ کی ضرورت نہیں۔ اس پر "بخمرھن" کی آیت نازل ہوئی کہ اجنبی مردوں سے جہاں بھی ہو چہرہ ڈھانکنے کی ضرورت ہے۔ کام کاج سے روکنے یا کمانے کی ممانعت کا سوال نہیں۔ نہ تعلیم کی بندش بلکہ صرف اجنبیوں کے سامنے نقاب ڈالنے کا حکم ہے۔

میں ممنون ہوں کہ مجھے اپنے ناچیز خیالات کے عرض کرنے کی فرصت بخشی گئی۔ ممکن ہے میرے خیالات پر اعتراض کی گنجائش پائی جائے اور میں خوشی سے اپنے خیالات بدلنے پر آمادہ ہوں۔ اگر کوئی مدلل چیز بیان کی جا سکے۔ وما توفیقنا الا باللہ۔

کتابیات۔ (میری ناچیز تالیفیں)

Constitutional Problems in Early Islam (in Islam Tetkikleri Enstitusu Dergisi, Faculty of Lettres, University of Istanbul, V/1-4, 197[illegible].)

The First Written-Constitution in the World, an important document of the time of the Prophet, Lahore, 3rd ed. 1975.

Muslim Conduct of State, Lahore 6th ed. 1973.

Political Significance of Zakat, (in Proceedings of All Pakistan Political Science Conference, session Lahore 1950)

Budgeting and Taxation in the Time of the Holy Prophet (in Journal of Pakistan Historical Society, III/1, 1955; and also in Islamic Review, Working/England, vol. 44/11, 1956.)

A Suggestion for an Interest-Free Islamic Monetary Fund (in Islamic Review, Working England, vol. 43/6, 1955.)

The Notion of Khilafat and its Modern Application (in Islamic Review, Working/England, vol. 45/3, 1957; and Journal of Pakistan Historical Society, Karachi, IV/4, 1956.)

Le Prophete de l'Islam, sa vie et son oeuvre 4e ed. Paris 1979 Le Saint Coran, traduction et notes, 10e ed. Beyrouth 1979, sous presse.

عہد نبوی میں نظام حکمرانی (طبع ثالث کراچی ۱۳۹۹ھ زیر طبع) بنوک القرض بدون ربا (الکویت، مکتبہ المنار)

خوشخبری

دعوات حق کی دوسری جلد

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ کے خطبات و مواعظ اور ارشادات کا عظیم الشان مجموعہ علم و حکمت کا گنجینہ جس کی پہلی جلد کو ہر طبقے میں سراہا گیا۔ اور اہل علم و خطباء اور تعلیم یافتہ طبقہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور جس کا کوئی ایک نسخہ بھی اس وقت دستیاب نہیں — الحمدللہ کہ انتظار شدید کے بعد اس کی دوسری جلد کتابت و طباعت کے مراحل سے گزر کر عنقریب شائقین تک پہنچنے والی ہے۔ تقریباً ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل اس دوسری جلد میں بھی دین و شریعت۔ اخلاق و معاشرت۔ علم و عمل۔ نبوت و رسالت۔ شریعت و طریقت کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر حضرت مدظلہ نے عام فہم اور درد و سوز میں ڈوبے ہوئے انداز میں گفتگو نہ کی ہو — آج ہی اپنا آرڈر بک کرا لیجیے ورنہ جلد اول کی طرح اس کی نایابی پر افسوس کرنا پڑے گا۔ صفحات ۵۴۰ قیمت چالیس روپے

موتمر المصنفین ۔ دارالعلوم حقانیہ ۔ اکوڑہ خٹک پشاور